اسلام اور کلی معاشیات کے منتخب نظریات کا مطالعہ
(صرف، بچت، سرمایہ کاری اور حکومتی نگرانی)

A Selected Study of Islam and Macroeconomics: Expenditure, Savings, Investments and Governmental Supervision

ڈاکٹر صبا نور*

Abstract:
Macroeconomics relates to economics elements at national level. Islam has conveyed its guidance in this sphere too. It encourages modest life style and thereby reduces expenditure, hence, increased savings. These savings can be utilized for investments to boost economy. Banking play an important role in creating pool of deposits used to finance businesses. Governmental regulatory intervenetions are at times involves controlling prices, preventing hoarding and monitoring adulteration. These issues have been discussed in this article with reference to relevant Islamic Teachings.

کلی معاشیات میں کسی بھی ملک کی معیشت کا مجموعی لحاظ سے تجزیہ و مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اسکے لیے انگریزی میں میکرو(Macro) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کے معنی "بڑے" کے ہیں۔ معاشیات کے اس موضوع میں معاشی نظام پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا جائزہ لیا جاتا ہے یعنی اس امر کا جائزہ کہ بحیثیت مجموعی صارفین اور آجرین کا انفرادی طرز عمل کس طرح ملکی معیشت

* Research Officer, Faculty of Islamic & Oriental Learning, Govt. College University, Faisalabad.

پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا کلی معاشیات میں پوری معیشت کی پیداوار، آمدنی، صرف، بچت، سرمایہ کاری، مجموعی طلب اوررسد، قیمتوں کی سطح، حکومتی آمدنی کا تفصیلی مطالعہ شامل ہے۔

کلی معاشیات کے موضوعات کواسلام کی تعلیم اوراصول وضوابط کے مطابق جانچااور پرکھاجاسکتاہے۔ فقہاء کرام نے اپنی کتب میں شریعت مطہرہ کے اصولوں کو سامنے رکھ کر مختلف معاشی معاملات سے متعلق جائزاور ناجائز صورتوں کو مدلل انداز میں پیش کیا۔ قومی آمدنی کی پیمائش کے تعین میں جن عوامل کا کردار نمایاں ہے ان میں صرف، بچت، سرمایہ کاری اور سود شامل ہیں۔

صرف اور بچت Consumption and Savings:

قومی آمدنی کا تعین اس ملک کے صرفی اخراجات سے لگایاجاتاہے۔ ہر ملک ایک متعینہ مدت کے اندراشیاء، خدمات پیدا کرتا ہے ان پر تمام آمدنی کواس طرح صرف کرتا ہے جس میں مجموعی خرچ مجموعی آمدنی کے برابر ہوتواسے قومی آمدنی کی متوازن صورت حال کہاجاتاہے۔ صارفین اپنی اشیاء ضروریات کے حصول کے لیے ان پر رقوم خرچ کرتے ہیں اوران پر جو اخراجات برداشت کئے جاتے ہیں ان کو صرف کہاجاتاہے۔

لہٰذا کسی ملک میں صرفی خرچ پورے ملک کے افراداوران کے کنبوں کے اخراجات کا مجموعہ ہوتا ہے جن کا انسان کی آمدنی سے گہرا تعلق ہے۔ آمدنی اوراخراجات سے متعلق ماہرین کے اپنے نقطہ نظر میں جن میں پہلا نظریہ ارونگ فشر(Irving Fisher) نے1930ء میں دیا۔ اس کے مطابق انسانی زندگی دو ادوار میں تقسیم ہوتی ہے۔ اس کے بعد 1936ء میں لارڈ کینز کا نظریہ منظر عام پر آیا جس کے مطابق ایک ملک میں بسنے والے افراد کے اخراجات کا انحصار ان کی آمدنیوں پر ہوتا ہے لہٰذا آمدنی میں اضافے سے صرف اور بچت دونوں ہی بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ معاشی ماہر فرانسو(Franco Modigliani)جس نے Life Cycle

Theory نظریہ پیش کیا جس پر اسے نوبل انعام ملا۔ ملٹن فریڈمین (Milton Friedman) جس نے آمدنی کا تصور پیش کیا اس کو بھی نوبل انعام ملا۔Sanjy, R کے مطابق :"لوگ صرف کرنے کا فیصلہ زندگی میں اپنے مقام اور دستیاب وسائل کے مطابق کرتے ہیں اِس پر فریڈمین نے 1956ء میں نہ صِرف تنقید کی بلکہ اِس کے مقابلے میں ایک نیا طریقہ مستقل آمدنی کا متعارف کرایااِس کے مطابق ایک صارف عارضی آمدنی کی بجائے مستقل آمدنی کو مدنظر رکھ کر اشیاء پر اپنا روپیہ صرف کرتا ہے جتنی آمدنی ہوگی اتنا ہی خرچ ہوگا"[1]

ان نظریوں کو صَرف(Consumption)کے جدید نظریات سے جانا جاتا ہے البتہ لارڈ کینز کے خیال میں انسان اپنی آمدنی کا سارا حصہ خرچ نہیں کرتا بلکہ ایک صارف ان میں توازن رکھتا ہے۔اس کے خیال میں آمدنی کا کچھ حصہ بچت کے طور پر بھی محفوظ رکھتا ہے۔اس کے مطابق بچت آمدنی پر منحصر ہوتی ہے جتنی کسی کی آمدنی خرچ کے مقابلہ میں زیادہ ہوگی اتنی ہی اس کی بچت زیادہ ہوگی۔

جدید معاشیات کے نظریات کے مطابق آجر صارف کی طلب کے مطابق اشیاء کو فروخت کے لیے مارکیٹ میں لاتا ہے۔خریدار متعلقہ شئے کی جو مقدار خریدنا چاہتے ہیں فروخت کار بھی اتنی ہی مقدار فروخت کے لیے پیش کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر تمام افراد اپنی آمدنیوں کو اشیاء کی خرید پر صرف کرتے ہیں لہٰذا کسی ملک کے اندر ایک سال میں اشیاء وخدمات کے حصول میں صارفین جو آمدنیاں خرچ کرتے ہیں اس کا تعلق انسان کی ضرورت اور طلب سے ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان کی بنیادی ضروریات کو تسلیم کیا گیا ہے اور انہیں حاصل کرنا فرض ہے۔اسلام انسانی زندگی کی بنیادی حاجات وضروریات کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اوران کی تکمیل کا درس دیتا ہے۔لیکن ساتھ ہی اخراجات میں میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے

اور حد سے زیادہ خرچ کو فضول خرچی اور اسراف میں شمار کرتا ہے جس کی قرآن اور حدیث میں ممانعت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تُسرِفُوا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ المُسرِفِینَ۔[2]

"بیہودہ صرف نہ کرو بیشک خدا تعالیٰ بیہودہ صرف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا"۔

اس آیت مبارکہ کی رو سے اسراف بلاشبہ ممنوع وناجائز ہے اہل لغت نے بھی اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ "التعریفات" میں ہے کہ:

الاسراف تجاوز الحد فی النفقة[3] "اسراف خرچ میں حد سے آگے بڑھنا ہے"

علماء نے تبذیر اور اسراف دونوں کے معنی ناحق صرف کرنا کے بتائے ہیں۔ اسی حوالے سے "تاج العروس" میں ہے کہ:

وضع الشئی فی غیر موضعه[4] "یعنی بے جا خرچ کرنا"

اس کی تائید میں ابن جریر "جامع البیان" میں لکھتے ہیں کہ:

کنا اصحاب محمد ﷺ نتحدث ان التبذیر النفقة فی غیر حق[5]۔

"ہم سے اصحاب محمد ﷺ بیان کرتے تھے کہ تبذیر غیر حق میں خرچ کرنے کا نام ہے"

مجمع بحار الانوار میں ہے کہ:

الاسراف والتبذیر النفقة بغیر حاجة او فی غیر طاعة الله[6]۔

"اسراف و تبذیر بغیر حاجت یا غیر طاعت الٰہی میں خرچ کرنا ہے"

ان عبارات سے یہ ثابت ہوا کہ ضرورت سے زائد خرچ اسراف اور فضول خرچی میں شمار ہوتا ہے۔ فقہا نے انسانی حاجات وضروریات کا بغور مشاہدہ کیا اور لوگوں کی معاشی معاملات میں راہنمائی کی۔ اس سلسلے میں حنفی فقیہ الشیخ احمد بن الحموی مکی کا نام سرفہرست ہے۔ آپ مدرس

اور فقیہ تھے۔ قاہرہ میں مدتوں تک مدرسہ سلیمانیہ اور رحمانیہ میں مسند درس پر متمکن رہے۔ آپ نے متعدد کتب تصنیف فرمای ہیں جن میں علامہ ابن نجیم مصری کی کتاب "لاشباوالنظائر" کا حاشیہ معروف ہے۔ اسی کتاب میں آپ نے انسانی ضرویات وحاجات کی درجہ بندی کی ہے اور لوگوں کو اسراف سے بچایاہے۔الشیخ حموی نےاسلامی تعلیمات کومد نظر رکھتے ہوئےانسانی حاجات و ضروریات کوپانچ حصوں میں تقسیم کیاہے۔

خمسة مراتب ضرورة وحاجة ومنفعة وزينة وفضول فالضرورة بلوغة حدان لم يتناول الممنوع هلك اوقارب وهذا يبيح تناول الحرام والحاجة كالجائع الذى لولم يجد مايا كله لم يهلك غير انه يكون فى جهد و مشقة وهذا الا يبيح الرام يبيح الفطر فى الصوم والمنفعة كالذى يشتهى خبز البرولحم الغنم والطعام الدسم، والزينة كالمشتهى الحلوى والسكر، والفضول التوسع باكل الحرام والشبهة۔[7]

(1)ضرورت (2)حاجت (3)منفعت (4)زینت (5)فضول

یعنی "ضرورت اس حد کو پہنچ جائے کہ اگر ممنوع شئے نہ کھائے توہلاک ہوجائے یاہلاکت کے قریب پہنچ جائے کہ انسانی زندگی خطرے میں پڑجائے توامام کے نزدیک حرام اور ممنوع اشیاء کو کھاناجائزہوجاتاہے۔حاجات میں وہ ضروریات زندگی شامل ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی کا گزارہ توممکن ہولیکن دقت اوردشواری سے جیسے اتنابھوکاہوکہ اگر کھانے کی چیز نہ پائے توہلاک تونہ ہو مگر تکلیف اور مشقت میں پڑجائے۔منفعت جیسے وہ شخص جو گہیوں کی روٹی، بکری کاگوشت اور چکنائی والے حلوے کے کھانے کی خواہش رکھتاہو اور زینت جیسے حلوے اور شکر کی خواہش رکھنے والا اور فضول یہ کہ حرام اور مشتبہ چیز کھانے کی وسعت اختیار کرنا۔"

الشیخ حموی نے انسانی ضرورتوں اور خرچ کی تفصیل بیان کی۔اسی تحقیق پر ماضی قریب میں الشیخ احمد رضا نے اپنی کتاب ''العطایا النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ''میں مزید بحث کی ہے اور ضروریات کی درجہ بندی کے ساتھ ہی شرعی احکام کی وضاحت بھی بیان کردی ہیں:

''ضرورت یہ ہے کہ اس کے بغیر گزارہ نہ ہو سکے جیسے مکان میں (جحریته خلله)وہ سوراخ جس میں آدمی سما سکے، کھانے میں (لقیمات یقمن صلبه) کہ چھوٹے چھوٹے لقمے سد رمق کریں اور اداے فرائض کی طاقت دیں ان کا پورا کرنا فرض کے درجے میں ہے، حاجت میں وہ ضروریات شامل ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی تکلیف سے گزرتی ہے ان کا پورا کرنا واجب و سنن موکدہ ہے، منفعت یہ ہے کہ بغیر اس ضرر تو موجود نہیں مگر اس کا موجود ہونا اصل مقصود میں نافع اور مفید ہے ان کا پورا کرنا سنن غیر موکدہ ہے، زینت یہ کہ مقصود سے بالائی زائد بات ہے شرعاًان کا حکم مستحب ہے، فضول جو کسی شے میں زیادہ ہو جائے اس کا حکم اسراف اور فضول خرچی میں آتا ہے یہ ازروے شرع حرام ہے''[8]

ان دونوں فقہاکرام کی عبارتوں سے یہ بات عیاں ہے کہ انسان اپنی آمدنی مختلف اشیائے ضروریہ پر صرف کرتا ہے لیکن اس معاملے میں بھی انسان کو کلیتا اختیار نہیں کہ وہ اسراف کی حد کو پہنچ جائے۔ انسانی حاجات و ضروریات کی درجہ بندی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

جدید معاشی نظریات میں صرف(Consumption)کے بارے میں معاشی ماہرین کی اپنی آراء ہیں جن میں انسانی آمدنی اور خرچ سے متعلق مختلف نظریات پیش کیے گئے ہیں خرچ کے بعد جو آمدنی بچ جاتی ہے اسے سرمایہ کاری میں لگا کر مزید منافع حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سرمایہ کاری(Investment):

بچت کے طور پر محفوظ کی گئی رقوم کو سرمایہ کاری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو اقتصادی

لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ دوسرے لفظوں میں بچتوں کا سرمایہ کاری سے گہرا تعلق ہے۔ کینز کی مساوات:　　　بچت = سرمایہ کاری

اس کے مطابق بچتیں زیادہ ہوں گی تو سرمایہ کاری بڑھے گی جس کا ملکی معیشت پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ لوگ بچت کے طور پر محفوظ کی گئی رقوم کو سرمایہ کاری میں اس لیے لگاتے ہیں کہ وہ مزید منافع حاصل کریں بسا اوقات منافع کی رقوم کو کاروبار کو وسعت دینے کی خاطر خرچ کیا جاتا ہے جس سے کاروباری سرگرمیوں میں ترقی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔[9]

اسلام مشترکہ طور پر سرمایہ کاری کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس میں سے متعدد صورتیں دور نبوی ﷺ میں بھی رائج تھیں جن میں شراکت و مضاربت سر فہرست ہیں۔ ان کا مقصد ہی نوع انسانی کے لیے آسانی اور سہولت پیدا کرنا تھا۔

مضاربہ میں سرمایہ ایک فریق (رب المال) کا ہوتا ہے اور دوسرا فریق (مضارب) اپنی محنت سے اس کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ مضاربہ کی بنیاد پر کیا جانے والا کاروبار شرع مطہرہ کی رو سے جائز ہے۔ احادیث مبارکہ سے اس کا جواز ثابت ہے۔ نبی ﷺ خود حضرت خدیجہ کا مال بطور مضاربت ملک شام لے کر گئے تھے۔ "التعریفات" میں مضاربہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"مضاربت کا مادہ ض۔ ر۔ ب ضرب بمعنی سفر کرنا ہے جس کے معنی زمین کے طول و عرض میں سفر کرنا مراد لیا جاتا ہے"[10]

"فتاویٰ عالمگیریہ" جو کہ فقہ حنفی کی معروف تصنیف ہے اس میں مضاربہ کے معاملات پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں ہے:

مضاربہ ایسا عقد ہے جس میں دونوں فریقین کے منافع کا تعین ہونا لازمی ہے۔ ایک نے بھی اپنے لیے منافع کی شرط لگا دی تو یہ عقد باطل ہو جائے گا۔ فتاویٰ عالمگری میں ہے:

فان قال على ان لك من الربح مائة درهم اوشرط مع النصف او الثلث عشرة دراهم لاتصح المضاربة ۔[11]

ترجمہ: اگر ایک نے دوسرے کو کہا نفع میں ایک سو درہم تیرے ہوں گے یا نصف یا ثلث کے ساتھ مزید دس درہم کی شرط لگائی تو مضاربت صحیح نہ ہو گی۔

الشیخ علاء الدین حصکفیؒ مضارب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

المضاربة ايداع ابتداء وتوكيل مع العمل لتصرفه بامره و شكرة ان ربح وغصب ان خالف وان اجاز رب المال بعده واجارة فاسدة ان فسدت فلا ربح للمضارب جنيئذٍ بل له اجر مثل عمله۔[12]

"مضارب ابتداء میں امین ہوتا ہے عمل کے بعد وکیل بن جاتا ہے مضارب ربُّ المال کے حکم سے اس مال میں تصرف کرتا ہے۔ مضاربت میں بعض دفعہ رب المال کیجانب سے لامحدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مضارب کو مال سے متعلق اختیار ہوتا ہے جس شہر میں بغرض تجارت جانا چاہے جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مضاربہ کے مال میں اپنا یا کسی کا مال شامل کر کے دونوں مالوں سے تجارت کر سکتا ہے لیکن یہ تمام اختیارات اس وقت حاصل ہوں گے جب مالک کی جانب سے کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی ورنہ جس بات کی وضاحت مالک نے کی مضارب پر اُس حکم کی پیروی کرنا لازمی ہو گا۔ اس کے علاوہ مضاربت کی غرض سے کیے جانے والے سفر کے تمام اخراجات مالک کے ذمے ہوتے ہیں"

شرکت اجتماعی سرمایہ کاری کا پرانا طریقہ ہے۔ اس کے تحت دو یا دو سے زائد افراد عموماً اس انداز سے کاروباری سرگرمیوں میں شریک ہوتے ہیں کہ نفع ونقصان میں برابری کی بنیاد پر حصہ دار ہوں گے۔ لفظ شرکہ کا مادہ ش۔ر۔ک ہے جو اپنی مختلف صورتوں کے ساتھ مختلف ملے

جلتے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ شریک بنانا یا کسی کو اپنے کام میں شریک کرنا۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کا تذکرہ ملتا ہے:

وَاِن تُخَالِطُوہُم فَاِخوَانُکُم[13]

"اور اس (نفقہ) کا کاروبار میں اپنے ساتھ ملالو تو وہ تمہارے بھی بھائی ہیں"

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیہِ شُرَکَآءُ مُتَشٰکِسُونَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ہَل یَستَوِیٰنِ مَثَلًا اَلحَمدُ لِلّٰہِ بَل اَکثَرُہُم لَا یَعلَمُونَ۔[14]

"اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے ایک غلام میں کئی بدخو آقا شریک اور ایک نرے ایک مولی کا، کیا ان دونوں کا حال ایک سا ہے سب خوبیاں اللہ کو بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے"

اسی طرح متعدد احادیث مبارکہ میں بھی اس کی وضاحت بیان کی گئی ہے:

عن أبي هريرة قال ان الله يقول أنا ثالث الشريكين ما لم يخن أحدهما صاحبه فاذا خانه خرجت من بينهما۔[15]

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں دو شریکوں میں شریک ہوں جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے خیانت نہ کرے لیکن اگر وہ خیانت کرے گا تو وہ ہاتھ ان سے اُٹھ جائے گا"

"العطایہ النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ" میں ہے:

"شرکت ایسا عقد ہے جس کا مقتضی دونوں شریکوں کا اصل و نفع دونوں میں اشتراک ہے ایک شریک کے لیے معین تعداد زر مقرر کرنا قاطع شرکت ہے کہ ممکن کہ اس میں اسی قدر نفع ہو تو کلی نفع کا یہی مالک ہو گیا دوسرے شریک کو کچھ نہ ملا تو نفع میں شرکت نہ ہوئی"[16]

عقد شرکت میں جتنے لوگ باہمی مشترکہ مال سے سرمایہ کاری کریں جتنے شرکاء ہوں گے سب کا نفع میں حصہ ہو گا۔ کسی ایک شخص کا اپنے لیے منافع کی مقدار متعین کر لینا یا تمام نفع خود وصول کرنا شرکت میں جائز نہیں۔

اس ساری بحث سے یہ تفصیل معلوم ہوتی ہے کہ شرکت کا معاہدہ جن فریقین کے مابین ہو مشترکہ سرمائے سے کی جانے والی تجارت سے جو بھی منافع وصول ہو تنہا کوئی ایک یا دو حصے دار منافع کے حقدار نہ ہوں گے اور نہ ہی کوئی منافع متعین کر سکتے ہیں یہ اصول عقد شرکت کے خلاف ہے بلکہ اس معاہدے کی اصل روح ہی یہ ہے کاروبار میں نقصان ہو جائے تو سب مل کر برداشت کریں گے جتنا منافع ہو سب اس میں حصے دار ہوں گے۔

درج بالا تفصیل سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جدید معاشی نظریات سے بہت قبل اسلام نے سرمایہ کاری کے ایسے طریقے متعارف کرا دیئے جس میں لوگ اجتماعی طور پر سرمایہ کاری کر کے کاروباری سرگرمیوں میں شریک اور جائز منافع حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ فقہا کرام نے ایسے بہت سے عقود متعارف کرائے جو موجودہ دور میں جدید اسلامی بنکاری کے تحت تمویل کے لیے استعمال ہو رہے ہیں اور ان بنکوں میں لوگ اپنی بچتوں کو کاروبار میں لگا کر منافع حاصل کرتے ہیں۔

سود اور اسلامی بنکاری:

جدید معاشی نظام میں سود کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ افراد اپنی کی گئی بچتوں کو بنکوں میں جمع کرواتے ہیں اور اس پر متعین شرح کے حساب سے سود وصول کرتے ہیں۔ کاروبار کی غرض سے سود پر قرضے حاصل کئے جاتے ہیں۔ سود کے نظریات پر ماہرین معاشیات کا متفق ہیں ان کی اپنی الگ الگ آراء ہیں۔ اس حوالے سے تین طرح کے مکتب فکر سامنے آئے۔ کلاسیکل، نو کلاسیکل اور تیسرا نظریہ لارڈ کینز کا پیش کردہ ہے۔ کلاسیکل مکتب فکر کے نزدیک شرح سود بچت کا معاوضہ

ہے۔بچتیں سرمائے کی شکل اختیار کرتی ہیں جن سے اشیائے صرف تیار ہوتی ہیں۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شرح سود کے تعین میں دوبڑی قوتیں سرمائے کی طلب و رسد اہم کردار ادا کرتیں ہیں یعنی بچتیں سرمائے کی رسد کا ذریعہ ہیں۔

نوکلاسیکل مکتب فکر کے خیال میں سود وہ قیمت ہے جو مختلف مقاصد کی تکمیل کے لیے قرضوں پر وصول کی جاتیں ہیں۔رقوم برائے قرضہ کی رسد اور طلب شرح سود کا تعین کرتے ہیں اس میں قرضے پر دی جانے والی رقم بنکوں کے ادھار، انفرادی،کاروباری بچتوں،سرمایہ کاری اورذخیرہ اندوزی پر مشتمل ہوتی ہے۔بنک جن افراد کو قرضہ کی رقم فراہم کرتا ہے اُس پر متعین شرح کے حساب سے سود وصول کرتا ہے جو ایک مخصوص مدت کے بعد قرض خواہ کو ادا کرنی ہوتی ہے۔ انفرادی بچتوں میں ہر شخص اپنے اخراجات کم کرکے بچت کے طور پر رقم جمع کرتا ہے۔ دوسری طرف کاروباری لوگ اپنے منافع کی رقوم بچت کے طور پر محفوظ رکھتے ہیں۔یہ رقوم جتنی زیادہ ہونے لگیں رقوم برائے قرضہ کی رسد میں اضافہ ہوتا ہے۔

تیسرا نظریہ لارڈ کینز کا پیش کردہ ہے۔اس کے خیال میں لوگ اپنی بچائی ہوئی رقوم میں سے کچھ حصہ اپنے پاس زر نقد کی صورت میں محفوظ رکھتے ہیں اور کچھ رقوم اپنے طور پر بطور قرضہ فراہم کرتے ہیں۔اگر وہ زر نقد کی طلب زیادہ کریں تو قرض پر دینے والی رقوم کم بچتی ہیں اس لیے شرح سود میں اضافہ ہوتا ہے۔[17]

اسلام میں سودی کاروبار کی قطعاً گنجائش نہیں جس کا ثبوت ہمیں شرع مطہرہ سے ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ سودی کاروبار،سودی قرض،سودی منافع کی جتنی بھی صورتیں سامنے آئیں علماء کرام نے ان کے عدم جواز پر اپنی تحریروں میں جامع و واضح انداز سے دلائل پیش کیے۔مختلف علماء وفقہاء کرام نے اس کی تعریف اپنے انداز سے کی ہے۔ علامہ برہان الدین المرغینانی اپنی کتاب

"الھدایہ "میں بیان کرتے ہیں کہ۔

"سود کو عربی میں ربوا کہتے ہیں جس کا مادہ "رب و" ہے اس کے معنی زیادت، نمو، بڑھوتی نشوونماوغیرہ کے ہیں"[18]

ربواوہ معاہدہ ہے جو قرض پر زیادتی کو ظاہر کرتا ہے جس میں ویسی زیادتی فریقین معاہدہ میں سے کسی ایک پر لازمی شرط کے طور پر کسی معاوضہ کے بغیر عائد کی جائے۔سود محض سادہ زیادتی کا نام نہیں ہے۔یہ ایک خاص قسم کا اضافہ ہے لہٰذا ربواوہ معاوضہ ہے جو ادائیگی کی مدت کے عوض ادا کیا جاتا ہے۔سود قطعی حرام ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰاَیُّہَا الَّذِینَ اٰمَنُوا لَا تَاکُلُوا الرِّبوا اَضعَافًا مُّضٰعَفَۃً وَاتَّقُوا اللّٰہَ ۔[19]

"اے ایمان والو! دو گنا چوگنا کر کے سود مت کھایا کرو اور اللہ سے ڈرا کرو تاکہ تم فلاح پاجاؤ"

لہٰذا اسلام میں سود کی حرمت کی بناء پر علماء بنکاری سے غیر مطمن رہے اور سودی بنکاری کے عدم جواز کے قائل رہے۔انھوں نے سود کو ناقابل قبول قرار دینے کے ساتھ ہی بنکاری کی اہمیت کو سمجھا اور سود کے بغیر بنکاری کی راہ ہموار کی۔

1970ء کی دہائی میں اسلامی بنکاری کے باقاعدہ قیام کے بعد سے اسلامی بنکاری نے مرحلہ وار ترقی کی ہے۔موجودہ وقت میں اسلامی بنکاری اور مالیات کے اثاثوں کا حجم قریب دو کھرب ڈالر ہے۔یہ اگرچہ عالمی بنکاری ومالیات جو200 کھرب ڈالر کے اثاثوں پر مشتمل ہے کا صرف ایک فیصد ہے تاہم اسلامی بنکاری کے رحجان اور ترقی کی رفتار تیز ہے۔

جدید اسلامی بنکاری میں بیع کی ایک سے زائد اقسام کو فنانشل پروڈکٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جن میں لین دین کے نقد و ادھار دونوں طرح کے معاملات طے کیے جاتے ہیں۔اس سلسلے میں بیع موجل، استصناع، مرابحہ اور اجارہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ بینک

رقوم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا واحد ذریعہ ہیں۔

جدید بنکاری کا ایک اہم کام رقوم کی منتقلی ہے۔ چند دہائیوں قبل رقوم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا واحد ذریعہ ڈاک خانہ تھا۔ وقت بدلنے کے ساتھ اور سائنسی ترقی کی بدولت اس میں بھی کئی طریقے متعارف ہو چکے ہیں جن میں آن لائن بنکنگ اور بینک ڈرافٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

معیشت کی حکومتی نگرانی:

معیشت کو منظم ترقی دینے کیلئے حکومت مارکیٹوں اور فروختکاروں کی نگرانی کرتی ہے تاکہ خریداروں کی حق تلفی نہ ہو اور مارکیٹیں بہتر انداز میں ترقی کریں۔ اس مقصد کیلئے حکومت متعدد طریقہ کار اختیار کرتی ہے۔ ان طریقہ کاروں میں سے پرائس کنٹرول، ذخیرہ اندوزی پر کنٹرول اور ملاوٹ سے متعلق اسلامی تعلیمات کو پیش کیا جارہا ہے تاکہ حکومت کے متوقع کردار کی نشاندہی ہو سکے۔

پرائس کنٹرول:

کئی ممالک میں حکومت کی جانب سے اشیاء کی قیمتیں مقرر ہوتی ہیں۔ پرائس کنٹرول کے حوالے سے معاشی ماہرین نے اعتراضات بھی کیے اس کے باوجود یہ پالیسی کامیابی کے ساتھ مختلف ممالک لاگو کرتے ہیں:

"قیمتوں پر حدود حکومتوں کی طرف سے شئے کی منڈی میں قیمت پر پابندی کو کہتے ہیں اِس حد کا مقصد اشیائے ضرورت وخوردونوش کی قیمتوں کو قابل خرید سطح پر رکھنا ہوتا ہے۔ قیمتوں پر حدود کے قائم کرنے کے دو طریقے ہیں، ایک زیادہ سے زیادہ قیمت کا تقرر اور دوسرا کم از کم قیمت جس پر کوئی شئے فروخت کی جاسکے"[20]

اشیاء کی قیمتیں آجر اور خریدار متعین کرتے ہیں۔ بعض اوقات حکومت وقت کی جانب

سے اشیاء کے نرخ مقرر ہوتے ہیں انہی قیمتوں پر اشیاء کو فروخت کیا جاتا ہے۔اشیاء کی طلب اور رسد دیکھ کر حکومت مداخلت کرتی ہے۔ الشیخ حصکفی کی کتاب ”در مختار“ میں ہے کہ:

اذا سعر وخاف البائع ضرب الامام لو نقص لا یحل للمشتری۔[21]

”اگر حاکم نرخ مقرر کر دے اور فروخت کرنے والے کو حاکم کا ڈر ہو اور وہ نرخ میں کمی کر دے تو ایسی صورت میں خریدار کے لیے (کم قیمت پر مال خریدنا) حلال نہیں“

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ علماء اشیاء کی فروخت اور نرخ کے معاملے میں حکومتی مداخلت کو بے جا اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ان کی آراء میں ہر فروخت کار اپنی شئے کا مالک ہے وہ جس قیمت پر چاہے اُسے فروخت کرے۔ حاکمِ وقت اس کو متعین نرخ پر فروخت کے لیے مجبور کرے اور فروخت کار شے اپنی خوشی اور رضامندی سے نہیں بیچے تو قرآنی حکم کے مطابق کسی مسلمان کے لیے اس کی چیز بغیر اس کی خوشی اور رضامندی کے لے لینا حلال نہیں ہو گا۔

ذخیرہ اندوزی:

ذخیرہ اندوزی ایک قبیح فعل ہے۔خاص کر اشیائے خورد ونوش کی ایسی ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے جس سے عوام پریشانی اور تنگی میں مبتلا ہو۔ان حالات میں اس فعل کی مذمت کی گئی ہے۔فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

الاحتکار مکروہ وذالك ان یشتری طعامافی مصر و یمتنع من بیعہ و ذالك یضر بالناس۔[22]

”غلہ کو اس نظر سے روکنا کہ گرانی کے وقت بیچیں گے بشرطیکہ اس جگہ یا اس کے قریب سے خریدا اور اس کا نہ بیچنا لوگوں کو مضر ہو مکروہ وممنوع ہے،اور غلہ دور سے خرید کر لائے اور بانتظار گرانی نہ بیچے یا نہ بیچنا اس کا خلق کو مضر نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں“

اس عبارت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ روزمرہ کھانے پینے کی اشیاء کی فروخت محض اس مقصد کے لیے روکنا کہ بازاروں میں مصنوعی قلت پیدا کی جائے اور اسے من مانی قیمتوں پر فروخت کیا جائے مکروہ ہے۔ علامہ شامی اپنی مایہ ناز تصنیف ”ردالمحتار علیٰ درِّ مختار“ میں فرماتے ہیں:

اثم بانتظار الفلاء والقحط لنیۃ السوئ للمسلمین۔[23]

”مہنگائی اور قحط سالی کے انتظار میں غلہ کو روک رکھنے سے گناہ گار ہوا کیونکہ اس میں مسلمانوں کے لیے بدخواہی ہے“۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آجر کے کسی عمل سے عوام کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اشیاء کی قلت میں ان کو مہنگے داموں زیادہ نفع کی غرض سے فروخت کیا جاتا ہے جبکہ دوسری جانب خریدار اسے مرضی اور رضامندی سے نہیں بلکہ ضرورت کی وجہ سے مجبوری میں خریدتے ہیں چونکہ گندم، غذائی اشیاء وہ ہیں جو انسانی حیات کے لیے لازم ہیں لہٰذا ان کی فروخت کو ترک بھی نہیں کیا جاسکتا لہٰذا ان کو زیادہ منافع کی غرض سے ذخیرہ کرنا ممنوع ہے۔

ملاوٹ:

خرید و فروخت کے معاملات میں خالص اور ناقص اشیاء دونوں کو ملا کر فروخت کیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ بیچنے والے فروخت کے وقت اعلی کوالٹی کا مال دیکھا کر خریدار کو مطمئن کر دیتے ہیں اور اسے اس سودے کی خرید پر راضی کر لیتے پھر بعد میں خراب اور ناقص اشیاء کی ملاوٹ کر دیتے ہیں جس سے خریدار لاعلم رہتا ہے۔ الشیخ حصکفی ”درِّ مختار“ میں لکھتے ہیں:

لا باس مبیع المغشوش اذابین غشہ اوکان ظاھرایری۔[24]

”اول تو خریدار کو علم ہو اور ملاوٹ ظاہر ہو خریدار دیکھ کر اس کو لینے پر راضی ہوا تو یہ اس کا اپنا فعل ہے لیکن جب خریدار سے چھپایا تو مت بیچے“

یعنی ملاوٹ والی چیز کو فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں جب اس کی ملاوٹ کو بیان کردے یاملاوٹ ایسی ظاہر ہو کہ دکھائی دیتی ہو۔یعنی بیچنے والے پرلازم ہے کہ ملاوٹ والی اشیاء کو فروخت کرنے سے پہلے خریدار کواس سے متعلق بتادے، مگراس قسم کی صورت حال عہد حاضر میں دیکھنے کو نہیں ملتی بلکہ دکاندار کواپنی شئے فروخت کرنے اور منافع حاصل کرنے سے غرض ہوتی ہے۔ مارکیٹ میں اشیاء کی فروخت اسی انداز سے ہورہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان معاملات کوشرع مطہرہ کے مطابق قائم کیاجائے۔

خلاصہ یہ کہ درج بالا مباحث سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ فقہائے کرام نے کلی معاشیات جیسے مخصوص موضوع سے متعلق بھی اسلامی تعلیمات کو واضح انداز میں اپنی کتب میں پیش کیاہے اور خصوصاً صرف، بچت، سرمایہ کاری اور پرائس کنٹرول، ذخیرہ اندوزی اور ملاوٹ سے متعلق حکومتی نگرانی کے کردار کو صراحت سے بیان کیاہے۔ ان کے یہ مباحث جدید کلی معاشیات کے بنیادی موضوعات سے متوازی ہیں نیز مسلمانوں کو کلی معاشیات کے نظریات کا اطلاق کرتے ہوئے دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

حوالہ جات

---

[1] Sanjay, R, Advanced Macroeconomics, Ventus Publishing APS,2012, P-48

[2] الانعام:141

[3] الجرجانی،سید شریف بن علی بن محمد،التعریفات،القاہرہ،دارالکتب العربی،2003ء،ص5

[4] الزبیدی،سید محمد مرتضیٰ،تاج العروس،بیروت:دارالدحیاء التراث العربی،1205ھ،ص1138

[5] طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تفسیر القران،بیروت: دارالاحیاء التراث العربی، س ن،ج15،ص86

[6] الفتنی، محمد طاہر، مجمع بہار الانوار، السعودیہ، مکتبہ دارالایمان، س ن، ج3، ص66

[7] الحموی، احمد بن محمد کلی، غمز العیون البصائر، کراچی: ادارۃ القرآن، س ن، ج1، ص119

[8] احمد رضاخان، الشیخ، العطایہ النبویہ فی الفتاویٰ رضویہ، لاہور، رضافاؤنڈیشن، 2006ء، ج1، ص843

[9] Hamouda, F.2009, Money Investment and consumption, Edward Elgar, Publishing, USA, P-59

[10] الجرجانی، سید شریف، التعریفات، ص173

[11] شیخ نظام و جماعۃ علماء ہند، فتاویٰ عالمگیریہ (ہندیہ)، پشاور، نورانی کتب خانہ، س ن، ج4، ص287

[12] الحصکفی، الشیخ علاؤالدین، در مختار علیٰ تنویر الابصار، دہلی، مطبع مجتبائی، س ن، ج2، ص146

[13] البقرۃ2:220

[14] الزمر:29

[15] سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب الشرکۃ، رقم الحدیث:3383

[16] احمد رضاخاں، فتاویٰ، لاہور، رضافاؤنڈیشن، 1999ء، ج17، ص371

[17] Zhang, Z, Finance Fundamental Problems Solution, 2013, P-18

[18] المرغینانی، برہان الدین، الھدایۃ، ص304

[19] اٰل عمران3:130

[20] www//:exonlib.org

[21] الحصکفی، در مختار، دہلی، مطبع مجتبائی، 1932ء، ج2، ص248

[22] شیخ نظام و جماعۃ علماء ہند، فتاویٰ عالمگیریہ، ج3، ص313

[23] شامی، الشیخ ابن عابدین، ردالمحتار علیٰ درِ مختار، بیروت، دارالاحیاالتراث العربی، ج5، ص256

[24] حصکفی، در مختار، ج2، ص52